رسائل و مسائل

اذکارِ مسنونہ

سوال: آج آپ کی خدمت میں ایک خلش پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ توقع ہے کہ میری پوری مدد فرمائیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ایک بریلوی خاندان کا فرد ہوں۔ بچپن میں غیر شعوری حالت میں والد بزرگوار نے حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین سلطان امیر مرحوم کے ہاتھ پر میری بیعت کرائی۔

حضرت سلطان باہو، ضلع جھنگ کے ایک مشہور باخدا بزرگ ہیں جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں گزرے ہیں۔ حضرت نے تبلیغ و اشاعت دین میں پوری ہمت دکھائی اور جہاد میں بھی شرکت فرمائی۔

سجادہ نشین سلطان امیر مرحوم فرائض کے پابند کبائر سے مجتنب خدا یار آدمی تھے۔ دربار پر جاتے تو مسنون طریقے سے دعائے مغفرت کرتے لوگوں نے دربار کا طواف شروع کر دیا تو موصوف نے دربار کے اندر ایک ایسی دیوار بنوا دی جس سے طواف ناممکن ہو گیا۔ اُن کے ان اعمال اور خدا یار ہونے کی وجہ سے مجھے ان سے بے حد عقیدت تھی۔ مگر افسوس کہ اکتساب سے قبل میری کم عمری میں انتقال فرما گئے۔ پھر ایک اور بزرگ سے کچھ اوراد حاصل کئے جنہیں باقاعدگی سے پڑھتا رہتا تھا کہ ۶۳ء میں جماعت کی رکنیت سے سرفراز ہوا۔

اس کے بعد میرے اندر ایک زبردست کشمکش ہوئی۔ وہ یہ کہ سکون قلب کے لئے رکنیت اور

اس کے تقاضوں کو پورا کرنا کافی محسوس ہوتا رہا۔ مگر ساتھ ہی اپنی توجہات کو سمیٹ کر ایک مرکز پر مجتمع رکھنے کے لئے اوراد و وظائف کی تشنگی محسوس ہوتی۔ اس مقصد کے لئے جب مختلف حضرات کی طرف نظر دوڑاتا تو اقامتِ دین کے بنیادی تقاضوں سے ان کی غفلت ان کی ساری وقعت گھٹا دیتی اس کشمکش میں مدت ہوئی مبتلا ہوں بعض دوستوں سے اپنی اس حالت کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ بالآخر طبیعت کا رجحان اس طرف ہوا کہ اس معاملہ میں بھی آپ ہی کی طرف رجوع کروں۔

میری درخواست ہے کہ اذکار و اورادِ مسنونہ میں سے کچھ ایسی چیز یا چیزیں میرے لئے تجویز فرمادیں۔ جو

(۱) میری طبیعت سے مناسبت رکھتی ہوں اور

(۲) جن سے پندرہ بیس پچیس منٹ صرف کر کے اپنی توجہات کو سمیٹنے میں مدد لیا کروں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اس معاملہ میں بھی رہنمائی کریں گے۔

جواب:۔ ذکر کے معاملے میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ ذکر پر تکلف نہ ہونا چاہیئے بلکہ دلی رغبت اور شوق کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ ذکر کا انتخاب اپنے دلی ذوق کی بنا پر کرنا چاہیئے۔ ذکر وہ کیجئے جس سے خود اپنی رُوح کی مناسبت آپ کو محسوس ہو، اور اس وقت کیجئے جب پوری توجہ اور رغبت کے ساتھ آپ کر سکیں۔ ان دو باتوں کو ذہن میں رکھ کر آپ مشکوٰۃ میں سے تین مقامات کو بغور پڑھیں۔ کتاب الصلوٰۃ میں سے باب الذکر بعد الصلوٰۃ اور باب صلوٰۃ اللیل، باب القصد فی العمل اور کتاب الدعوات پوری ان حصوں میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذکر و دعا کس طرح فرماتے تھے اور دوسروں کو آپ نے کیا کیا چیزیں اس سلسلہ میں بتائی ہیں۔ ان میں سے جو جو چیزیں بھی آپ کے دل کو لگیں ان کا انتخاب کر لیجئے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہؓ کی رنجیدگی

سوال:۔ ایک شیعہ عالم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت صدیق اکبرؓ سے تا دم

مرگ ناراض رہیں اور انہیں بد دعا دیتی رہیں۔ انہوں نے اس امر کے ثبوت میں الامامۃ والسیاسۃ کے حوالے دیئے ہیں جو ابنِ قتیبہ کی تصنیف ہے۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابنِ قتیبہ کو سنی علما مستند مانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی الفاروق میں سے ایک عبارت دکھائی ہے جس میں اس مصنف کو نامور اور قابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے۔ نیز شیعہ عالم نے یہ بھی بیان کیا ہے۔ کہ آپ نے بھی اپنے رسالہ "اسلامی دستور کی تدوین" میں الامامۃ والسیاسۃ میں سے ایک خط نقل کیا ہے جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے حضرت عائشہؓ کو لکھا تھا۔ براہِ کرم حضرت فاطمہؓ کی ناراضگی کی حقیقت واضح کریں۔ نیز اس امر سے بھی مطلع کریں کہ ابنِ قتیبہ کی کتاب کا علمی پایہ کیا ہے اور وہ کس حد تک قابلِ اعتبار ہے۔

جواب:۔ ابنِ قتیبہ تو بلا شبہ ایک محقق شخص تھے لیکن ان کی جس تصنیف کا حوالہ شیعہ عالم نے دیا ہے، اس میں بعض چیزیں ایسی موجود ہیں جو عقلاً قابلِ قبول نہیں ہیں۔ خصوصاً حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی سیرت کا جو نقشہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کا کھینچا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کے بارے عقیدت تو درکنار اچھی رائے کا برقرار رہنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۲ کا مضمون آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے اور خود ہی رائے قائم کیجئے کہ آیا ایسی روایات قابلِ قبول ہو سکتی ہیں۔ قبول کرنا تو ایک طرف، میں تو اسے اس قابل بھی نہیں سمجھ سکتا کہ انہیں نقل کر کے آپ کے سامنے پیش کروں۔ اسی طرح کی چیزیں دیکھ کر بعض اہلِ علم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ کتاب یا تو ابنِ قتیبہ کی ہے ہی نہیں یا کم از کم اس میں بعض چیزیں ضرور الحاقی ہیں۔ میں نے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی نقل کیا ہے۔ اس لئے میرا انحصار صرف الامامۃ والسیاسۃ پر نہیں ہے۔

مسئلہ خلافت سے قطع نظر جہاں تک حضرت فاطمہؓ کے دعوئے میراث کا تعلق ہے اس کے لئے ابنِ قتیبہ کی الامامۃ سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے اس کی تفصیلات تو صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کی مستند روایات سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی

رہتے کہ حضرت فاطمہؓ میراث کے معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ناراض تو ضرور ہوئی تھیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے جس بنا پر حضرت فاطمہ کے دعوے کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی میراث ان کے وارثوں میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ان کا ترکہ صدقہ ہے یہ بات ابن قتیبہ کے ہاں بھی مذکور ہے اور کسی جگہ بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا نقل کردہ فرمان نبوی صحیح نہ تھا یا حضرت فاطمہؓ کو اس کی صحت سے انکار تھا۔ اب آپ خود غور کر لیجئے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کرنا واجب تھا یا اس کو نظر انداز کر کے حضرت فاطمہؓ کی رضا حاصل کرنا ضروری تھا۔ ہم تو اس بات کا بھی تصور نہیں کر سکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سننے کے بعد اُسے قبول کرنے کے بجائے حضرت فاطمہ اُس طرح غضبناک ہوئی ہونگی جس طرح غضبناک ہونے کا نقشہ ابن قتیبہ نے کھینچا ہے۔ اگر وہ رنجیدہ ہوئی تھیں اور اس کا انھوں نے کسی شکل میں اظہار بھی کیا تھا۔ تو اس کی زیادہ سے زیادہ بہتر تاویل یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشاد کو کسی اور معنی میں لیتی ہوں گی۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے جو مفہوم اس کا سمجھا تھا۔ اُس سے انھیں اتفاق نہ ہوگا۔ یہ تاویل اس واقعہ کی نہ کی جائے تو پھر اس الزام سے حضرت فاطمۃ الزہرہ کو نہیں بچایا جا سکتا کہ وہ مال کی محبت اتنی زیادہ رکھتی تھیں کہ خود اپنے والد ماجد اور اللہ کے رسول کے قول کی انہوں نے پرواہ نہ کی۔ کیا سیدۃ النساء کے متعلق کوئی مسلمان ایسی بری رائے رکھنے کے لئے تیار ہے؟ خلفائے راشدین اور اہل بیت کے باہمی تعلقات کی ایسی تصویر ہمارے لئے آخر کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہے جو فریقین میں سے کسی کی بھی شان اور عظمت میں اضافے کا موجب نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ہاں اس امر میں بھی روایات مختلف ہیں کہ آیا حضرت فاطمہ اس واقعہ کے بعد آخر وقت تک ناراض رہیں یا بعد میں راضی ہوگئیں۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ ان کی رنجش آخری وقت تک رہی اور بعض میں یہ ہے کہ حضرت ابوبکر بعد میں خود ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے اور انہیں راضی کر لیا۔ یہی بات میرے لئے قرین صواب ہے۔

مسئلہ سود کے متعلق چند اشکالات

سوال :- میں معاشیات کا طالب علم ہوں۔ اس لئے اسلامی معاشیات کے سلسلے میں مجھے جس قدر کتابیں مل سکی ہیں میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ "سود" کے بعض ابواب میں نے کئی کئی بار پڑھے ہیں لیکن بعض چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

" کچھ دن ہوئے میں نے آپ کو یہ سوال لکھا تھا کہ آپ خرچ پر جس قدر زور دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ صرف یہی ہوگا کہ اسلامی ریاست میں سرمایہ کی شدید کمی ہو جائے گی اور ملک کی صنعتی ترقی رک جائے گی۔ اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا تھا۔ کہ سود میں اس کا جواب موجود ہے۔ متعلقہ ابواب کو دوبارہ پڑھا جائے۔ میں نے کئی بار ان ابواب کو پڑھا ہے اور میرا اعتراض قائم ہے۔ لہٰذا میں آپ کے پیش کردہ دلائل کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں اور پھر اپنا اعتراض پیش کرتا ہوں۔

آپ کا استدلال یہ ہے کہ لوگ دل کھول کر خرچ کریں تو ہر چیز کی مانگ بڑھے گی اس کا نتیجہ یہ ہوگا PRODUCERS اپنی پیداوار بڑھائیں گے۔ یعنی زیادہ عوامل کو روزگار مہیا کریں گے۔ عوامل پیداوار FACTORS OF PRODUCTION کی بڑھتی ہوئی آمدنی کے نتیجہ میں چیزوں کی مانگ اور بڑھے گی۔ غرضیکہ معاشی خوشحالی کا ایسا چکر چلے گا جس سے کہ ایک طرف عوامل پیداوار کی آمدنی اور معیارِ زندگی بلند ہوتا چلا جائے گا اور دوسری طرف PRODUCERS کی بکری اور منافع بڑھتا چلا جائے گا۔

اس کے بعد آپ یہ کہتے ہیں کہ صنعتوں کے لئے سرمایہ بڑھتے ہوئے منافع اور بڑھتی ہوئی آمدنی سے بچی ہوئی رقم میں سے فراہم ہو جائے گا۔

اب میں اپنے اعتراضات بیان کرتا ہوں۔ میں شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سود کی بندش سے پس اندازی کا سلسلہ رک جانے کا مجھے کوئی خدشہ نہیں ہے

میرا اساسی اعتراض یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خرچ کرو کی پالیسی صحیح پالیسی نہیں ہے۔

آپ کے پورے استدلال کی تہ میں یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ ملک پہلے سے ہی پوری طرح صنعتی ترقی کر چکا ہے اب صرف سالانہ DEPRECIATION اور REPLACEMENT کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ لوگوں کی پس انداز کرنے کی عادت کی بنا پر ملک کی موجودہ صنعتی CAPACITY بھی پوری طرح استعمال نہیں ہو رہی۔

پہلا نتیجہ میں نے اس طرح اخذ کیا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اولاً صنعت کا اندرونی منافع ہی سرمایہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہوگا، ورنہ دل کھول کر خرچ کرنے کے بعد بھی جو بچے گا وہ سرمایہ کی کمی کو پورا کر دیگا لیکن یہ تبھی ممکن ہے کہ جب صنعت پہلے سے خوب ترقی یافتہ ہو۔ اگر صنعت بالکل نہ ہو، یا ابتدائی مراحل میں ہو تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اندرونی سرمایہ ہی یا تھوڑا سا باہر کا سرمایہ ملا کر ضرورت پوری ہو جائے۔ مثال کے طور پر پاکستان کا شش سالہ پلان لیجئے باوجود اس کے کہ یہ پلان ہماری ضروریات کے لحاظ سے انتہائی حقیر ہے اور اس میں ملکی ضروریات سے زیادہ سرمایہ کی فراہمی کے مسئلہ کو پیش نظر نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس پلان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے صنعتی اور ملکی سرمایہ ملا کر اور غیر ملکی سرمایہ کو بھی شامل کر کے سرمایہ کی ضروریات پوری نہیں ہو رہیں اور حکومت کو خسارے کا بجٹ بنانے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ یہی حال ہندوستان، انڈونیشیا، جاپان وغیرہ ممالک کا ہے جتنے پسماندہ ممالک ہیں کسی کا ملکی سرمایہ بھی اس کی صنعتی ضروریات کے لئے کافی نہیں۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ صنعت کا اپنا سرمایہ اور تھوڑی بہت پسماندہ رقم ہماری صنعتی ضروریات کے لئے کافی ہوگی کس طرح صحیح ہے۔ اسی بنا پر I.B.D.R. I.MF وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔

دوسرا مفروضہ میں نے اسی طرح نکالا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ جب لوگ زیادہ خرچ کریں گے تو روزگار بڑھے گا اور PRODUCERS زیادہ عوامل پیداوار سے روزگار مہیا کریں گے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے کہ جب EXCESS CAPACITY موجود ہو۔ اگر زائد قوت

EXCESS CAPACITY موجود نہ ہو یعنی کارخانے اپنی CAPACITY سے کم کام نہ کر رہے ہوں یا سرے سے کارخانے ہی موجود نہ ہوں، جیسا کہ عام طور پر پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔ تو زیادہ خرچ کرنے کا نتیجہ سوائے افراطِ زر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، دوسرے ممالک کو چھوڑیئے۔ خود اپنے ہی ملک میں ہمیں اس کا بہت تلخ تجربہ ہوا ہے۔ دوران جنگ میں جب کارخانے دن رات کام کر رہے تھے لیکن روپے کی فراوانی کی بناء پر لوگ خوب خرچ کر رہے تھے۔ اس وقت صنعت میں برائے نام ہی ترقی ہوئی تھی۔ البتہ INFLATION خوب بڑھ گئی تھی۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ زیادہ خرچ کرنے سے صنعت کو فروغ ہوگا، کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ آپ کی معاشیات تنزل پذیر DEPRESSION ECONOMICS ہے اور DEVELOPMENT ECONOMICS ترقی یافتہ نہیں ہے، یا آپ کا نسخہ ترقی یافتہ ممالک میں تو کارگر ہو سکتا ہے پسماندہ ممالک میں نہیں۔

یہ تو تھا آپ کے دلائل کا جائزہ اور ان پر میرا اعتراض۔ اب میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرو کی پالیسی کے خلاف چند دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

i. ہر قسم کے اخراجات معاشی نقطۂ نظر سے مفید نہیں ہیں اگر PRODUCERS اپنا زائد منافع صنعت میں لگا دینے کے بجائے قیمتی مکانات، قیمتی لباس، قیمتی فرنیچر وغیرہ پر صرف کر دیں تو ملکی صنعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بلکہ الٹا نقصان ہی پہنچے گا۔ کیوں کہ وہ رقم صنعتی سرمایہ نہ بنی علاوہ ازیں اتنی رقم صنعتی پیداوار پر صرف ہونے سے بھی رہ گئی۔ اس طرح اتنی مالیت کی پیداوار فروخت نہ ہو سکی اور ایسے اخراجات حرام نہیں ہیں۔ لہٰذا زیادہ خرچ کرو کی پالیسی معاشی مسائل کا حل نہیں ہے۔

ii. "زیادہ خرچ کرو" کی پالیسی پسماندہ ممالک کے لئے نقصان دہ ہے۔ ایسے ممالک میں چونکہ ملکی صنعت برائے نام ہی ہوتی ہے اس لئے خرچ کا بیشتر حصہ درآمد شدہ (IMPORTED) اشیاء پر صرف ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی زرِ مبادلہ پر بہت بوجھ (DRAIN)

پڑتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی ان ممالک کے غیر ملکی وسائل بہت محدود ہوتے ہیں پھر اوپر سے
CONSUMPTION EXPENDITURE کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کی وجہ سے
مشینوں کی درآمد کے لئے بہت کم وسائل رہ جاتے ہیں۔ لہذا "زیادہ خرچ کرو" کی پالیسی سے
صنعتی ترقی کو سخت نقصان پہنچتا ہے جب خرچ کا دباؤ زیادہ پڑ رہا ہو تو یہ بھی نہیں ہو
سکتا کہ CONSUMPTION GOODS کی درآمد بند کر دی جائے۔ کیونکہ پھر
ملک میں INFLATION کا چکر چلنے لگے گا۔ ان دونوں صورتوں کا تجربہ ہم نے خوب
کیا ہے۔ پہلی صورت کا تجربہ فضل الرحمن صاحب کا O.G.L تھا۔ دوسری صورت
کا تجربہ 1953 سے ہو رہا ہے۔ اور دونوں تجربات کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔

iii ۔ "زیادہ سے زیادہ خرچ کرو" کی پالیسی اور بسرعت صنعتی ترقی کی خواہش بالکل متضاد
ہیں۔ ہر ملک کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ ان وسائل کو دو طرح سے خرچ کیا جا سکتا ہے ـــــ
CONSUMPTION پر اور PRODUCTION پر۔ جتنے زیادہ وسائل
CONSUMPTION DEMAND کو پورا کرنے کے لئے صرف کئے جائیں گے اتنے
ہی کم وسائل PRODUCTION DEMEND کو پورا کرنے کے۔ رہ جائیں گے
یہاں الٰہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ جس طرح جب چاہا جتنا چاہا جس غرض کے لئے چاہا مہیا ہو گیا
اور مستقبل کے متعلق فکر بھی نہ کرنا پڑی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے بے شمار مثالیں
دی جا سکتی ہیں۔ میں صرف ایک عام فہم مثال دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔ انگلستان میں آج کل بھی
رہائشی مکانات کی بہت قلت ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگ بنانا نہیں چاہتے۔ بلکہ
وجہ یہ ہے کہ وسائل کی کمی زیادہ مکانات بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ جتنا زیادہ لوہا سیمنٹ
صرف کیا جائے گا اتنا ہی کم دوسری صنعتوں کے لئے رہ جائے گا۔ اسی لئے معاشی
کونسل ہر صنعت کے لئے تمام عوامل کا QUOTA مقرر کر دیتی ہے تاکہ سب کو
کچھ نہ کچھ حصہ مل جائے اور کوئی کام بند نہ ہو۔

۷۸ ۔ کوئی پسماندہ ملک بغیر CONSUMPTION EXPENDITURE کو کم کئے اور بغیر اپنی قومی آمدنی کا خاصہ حصہ پس انداز کئے ترقی نہیں کر سکتا۔ بیرونی امداد اور بیرونی سرمایہ کی بڑی سے بڑی رقوم بھی ایسے ملک کے سرمایہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں اگر یہ ممالک CONSUMPTION EXPENDITURE کو کم کرنے اور زیادہ سے زیادہ پس انداز کرنے پر تیار نہیں ہیں تو پھر صنعتی ترقی کے خواب ہی دیکھتے رہیں ۔ اور ان خوابوں کے پورا ہونے میں بہت وقت لگے گا اور بہت قربانیاں دینی پڑیں گی ۔ اس دعویٰ کا بہترین ثبوت روس اور جاپان پیش کرتے ہیں، گوکہ سیاسی اعتبار سے دونوں ممالک میں بعد المشرقین ہے۔ لیکن معاشی ترقی کے لئے دونوں نے ایک ہی ذریعہ اختیار کیا۔ دونوں ہماری طرح ہی بدحال تھے ۔ دونوں کو غیر ملکی سرمایہ نہیں ملا اور دونوں سرعت سے صنعتی ترقی کے خواہاں تھے لہٰذا انہوں نے CONSUMPTION EXPENDITURE کو کم کیا اور قومی آمدنی کا ایک خاص حصہ جبراً پس انداز کیا اور اس سرمایہ سے اپنی صنعتیں کھڑی کیں۔

2۔ میرا دوسرا بڑا اعتراض سود حصہ دوم میں دیئے ہوئے بنکنگ کے تجزیہ پر ہے ص۱۲۱ سے ص۱۲۳ تک آپ نے بنکنگ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح پہلے سناروں نے امانتداروں کا سونا قرض دینا شروع کر دیا اور پھر اس طرح اس سونے کے بل پر ۱۰ گنا قرض دینے لگے ۔ آپ کہتے ہیں کہ اس طرح ان لوگوں نے ۹۰ فیصد جعلی روپیہ بالکل بے بنیاد کرنسی کی شکل میں بنا ڈالا اور خواہ مخواہ اس کے مالک بن بیٹھے اور سوسائٹی کے سر پر اس کو قرض کے طور پر لاد لاد کر اس پر دس بارہ فیصد سود وصول کرنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ سنار اس مسلسل جعلسازی سے ملک کی ۹۰ فیصدی دولت کے مالک ہو چکے تھے

اس پورے تجزیہ سے مجھے سراسر اختلاف ہے۔ جہاں تک آپ نے بنکنگ کی تاریخ بیان کی ہے ۔ وہاں تک مجھے کوئی اختلاف نہیں۔ میرا اختلاف ان باتوں سے ہے جنہیں میں نے آپ کے الفاظ میں تلبسند کیا ہے ۔ میں یہ کہتا ہوں کہ

i ۔ وہ سرمایہ جعلی نہیں ۔ ii ۔ بینکر کی ملک نہیں ۔

iii ۔ وہ سوسائٹی پر زبردستی قرض کی صورت میں لادا نہیں گیا ۔

iv بنکر ملک کی ۹۰ فیصد دولت کے مالک نہیں بن گئے تھے ۔

v ۔ روپیہ تخلیق CREATE کرنے کا عمل بنکنگ کی ابتدا میں ہی نہیں ہوا تھا، بلکہ روز ہوتا ہے ۔ ان باتوں کو ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنکنگ کی حقیقت کو جس طرح میں نے سمجھا ہے اسے بیان کر دوں ۔

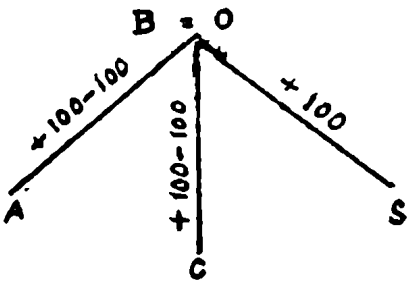

ایک شخص بنک کھولتا ہے ۔ اس کے پاس اپنا کوئی سرمایہ نہیں اور نہ ہی کوئی امانتدار اس کے پاس رقم رکھاتا ہے ۔ چونکہ بنک صفر سے قائم ہوتا ہے (B = O) ۔ اس کے پاس ایک شخص A آتا ہے اور ۱۰۰ روپے قرض مانگتا ہے ۔ بنک اس کی درخواست قبول کر لیتا ہے لیکن نقدی کی صورت میں کچھ بھی نہیں دیتا ۔ بلکہ اس کے نام ۱۰۰ روپے اپنے کھاتے میں جمع کر لیتا ہے (A +100 ؛ اب A بازار میں C سے کچھ مال خریدتا ہے اور اسے ۱۰۰ روپوں کا چیک دے دیتا ہے ۔ C اسے بنک میں جمع کرا دیتا ہے بنک A کے کھاتہ سے ۱۰۰ روپے گھٹا دیتا ہے —— (A +100 − 100 = 0) اور سی کے نام جمع کر لیتا ہے (C +100) بازار میں ۱۰۰ روپے کی چیز C سے A کے پاس چلی گئی اس کے عوض میں اسٹیٹ بنک کا ایک نوٹ بھی نہ دیا گیا، بلکہ B کے کھاتے میں ۱۰۰ روپے کا اندراج کر دیا گیا ۔ بنک (B) کے پاس پہلے بھی کوئی رقم نہ تھی اور اب بھی کوئی رقم نہیں ہے اب C مال خریدتا

ہے اور S کو ۱۰۰ روپے کا چیک دے دیتا ہے۔ بنک C کے کھاتے سے ۱۰۰ روپے گھٹا دیتا ہے اور S کے نام جمع کر دیتا ہے، غرضیکہ اسی طرح تجارت کا چکر چلتا رہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بنکر کے پاس اپنا کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی ۱۰۰ روپے کا قرض دے دیا اور بنک کا قرض بازار میں کرنسی نوٹوں کی طرح چل رہا ہے اس رقم سے اس طرح خرید و فروخت ہو رہی ہے جس طرح عام نوٹوں سے ہوتی ہے اور بنک صفر سرمایہ سے کام شروع کرنے کے باوجود ۱۰۰ + روپے سود کا مالک بن بیٹھتا ہے، یہ دیکھ کر آپ پکار اٹھتے ہیں کہ بنکر جعلساز ہے۔ اس نے خود ہی جعلی روپیہ بنایا اور اس کا مالک بن کر اسے سوسائٹی پر قرض کی صورت میں لاد دیا۔ اس طرح اتنی ملکی دولت اس کے قبضہ میں چلی گئی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا واقعی یہ احتجاج صحیح ہے۔

میں نے بنک کو صفر سرمایہ سے اس لئے شروع کیا ہے کہ آپ کے الزامات کی سنگینی پوری شدت سے ابھر آئے اور روپے بنانے میں ۱:۱۰ کے تناسب کی قید بھی حائل نہ ہو۔ پوری پوری رقم ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام تبدیل کرنے میں حسابی سہولت مقصود ہے۔

ہماری مثال میں اب صورت حال یہ ہے کہ بنک کے پاس ایک دھیلہ بھی نہیں لیکن بنک کو A سے ۱۰۰ روپے ملنے ہیں، کیوں کہ یہ رقم اس نے بنک سے قرض لی تھی۔ اس رقم کے علاوہ بنک کو سود بھی ملتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ بنک کے کھاتے میں S کے نام ۱۰۰ روپے جمع ہیں یعنی بنک نے S کو ۱۰۰ روپے دینے ہیں یعنی بنک کو اگر ایک طرف سے سود + ۱۰۰ ملتا ہے تو دوسری طرف اس کے ذمہ ۱۰۰ روپے واجب الادا بھی ہیں۔

اب پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔

۱۔ وہ رقم جو بنک نے پیدا کی تھی وہ بنک کی ملک نہیں ہے وہ بجائے ...

(S) کی ملک ہے۔ بنک صرف سود کی رقم کا مالک ہے۔

iii۔ لہذا بنک نے کوئی جعلی سرمایہ نہیں بنایا۔ اس نے صرف بچانے والے کی رقم کو ادھار پر لگایا ہے۔

iiii۔ بنک سوسائٹی کی ۹۰ فیصد دولت کا مالک نہیں بن رہا۔

iv۔ بنک سوسائٹی کے سر پر زبردستی کوئی قرض نہیں لاد رہا۔ دولت بچانے والا جس دن چاہے اس چکر کو بند کر سکتا ہے۔ (S نے بنک سے نقد اپنے ۱۰۰ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ بنک نے A سے کہا کہ میرا دیا ہوا قرض واپس دو۔ A نے ۱۰۰ + سود واپس کر دیا۔ بنک نے S کو سو روپے دے دیئے اور سود کا کچھ حصہ خود رکھ لیا کچھ S کو دے دیا۔ اب بنک پھر خالی ہاتھ ہے نہ اس کا کسی پر قرض ہے اور نہ ہی اس کے ذمہ کوئی قرض ہے۔)

اگر بنک جعلی روپیہ بنا سکتے تو وہ کبھی فیل نہ ہوتے۔ فیل وہ ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ جعلی روپیہ نہیں بنا سکتے۔ امانتدار اپنے روپے طلب کرتے ہیں اور بنک بعض اوقات فوری طور پر اپنے قرض واپس نہیں لے پاتا۔ امانتدار فوری نقدی طلب کرتے ہیں۔ اس لئے امانتداروں کے تقاضے بنک پورے کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اور لال بتی جلا دیتے ہیں۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ساہوکاروں نے اپنی ترقی کے ابتدائی دور میں ایک کے دس بنائے تھے۔ اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ روز ہر بنک ایک روپے کے بل پر دس روپے قرض دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بنک قرض اپنے نوٹوں کی شکل میں دیتے تھے اب چیک کی صورت میں دیتے ہیں۔ لیکن نوٹ اور چیک دونوں کی ماہیت اور دونوں کی THEORY ایک ہی ہے۔ دونوں

بنک کے ذمہ واجب الادا رقوم کے ثبوت ہیں۔ چونکہ CREATION OF MONEY
تخلیق زر کے طریقہ سے آپ بخوبی واقف ہیں اس لئے اسے
دہرانا بیکار ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری کم فہمی کی بنا پر یا آپ کی عبارت
کی ساخت کی بنا پر مجھے یہ خیال گزرا۔ آپ اس عمل کو بنکنگ کی تاریخ کا ایک پرانا
باب سمجھتے ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟

3 - میرا تیسرا اور آخری سوال کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ فقہی استفسار ہے کیا اسلامی
بنکنگ میں تجارتی بنکوں کو تخلیق زر کی اجازت ہوگی یا نہیں - - - - - - - - -
اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر اس کی اجازت نہ ہوگی تو اعتباری نظام میں لچک
کس طرح پیدا کی جائے گی؟

امید ہے کہ آپ میرے اعتراضات کے تشفی بخش جواب دے کر میرے ذہن
کو اطمینان بخشیں گے۔

جواب:۔ آپ کا خط ۱۲ اکتوبر کو ملا۔ میرے پاس آپ کے سوالات محفوظ رکھے تھے، مگر کام کی کثرت اور مسلسل سفروں کی وجہ سے پڑھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی کہ جواب لکھ سکتا۔ اب آپ کی یاد دہانی پر یہ مختصر جواب حاضر ہے۔ تفصیلی بحث کی فرصت نہیں صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

آپ کا پہلا اعتراض دو مفروضوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ "صرف کرو" کی تبلیغ فوراً یہ نتیجہ دکھادے گی کہ لوگ بے تحاشا صرف کرنا شروع کر دیں گے اور روپیہ بچانے یا کام پر لگانے کے سارے رجحانات بھی ختم ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ صرف کرو سے مراد اپنے اوپر ہی صرف کرنا اور ضروریات سے گزر کر تعیشات پر صرف کر دینا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ہی باتیں درست نہیں ہیں۔ صرف کرنے کا رجحان بتدریج بڑھے گا۔ اس دوران میں اگر ساتھ ساتھ صنعتی ترقی کے لیے بھی کوشش جاری رہے تو اس کام کے لیے روپیہ ملتا رہے گا اور ان دونوں چیزوں کے متوازن نشوونما سے جیسے جیسے صنعتیں بڑھیں گی ان کے پیدا کردہ مال کی کھپت بھی بڑھتی اور صنعتوں کے لیے مزید ترقی کا سامان لاتی چلی جائیں گی۔ پھر چونکہ

صرف کر دینے سے ہماری مراد صرف اپنی ہی ذات پر صرف کرنا نہیں، بلکہ انفاق فی سبیل اللہ بھی ہے۔ اس پیسے روپے کا ایک بڑا حصہ ان طبقوں میں جائے گا جن کی قوت خرید بحالت موجودہ بہت گھٹی ہوئی ہے اور وہ قوت خرید پیدا ہو جانے کے بعد اپنی ہر قسم کی ضروریات لینی شروع کر دیں گے جن سے تمام مختلف قسم کی صنعتوں کی آبیاری ہوگی۔ میرے ان دونوں بیانات کے پیچھے یہ بات بنیادی مفروضے کے طور پر کام کر رہی ہے کہ ملک کا نظام ایسے دانشمند لوگوں کے ہاتھوں چل رہا ہو۔ جو ایک طرف اخلاق عامہ کی اصلاح اور صحت مند ذہنیت کی تخلیق کر رہے ہوں اور دوسری طرف تمام ان ذرائع کو جو ملک کے اندر فراہم ہو سکتے ہوں، ترقی کے کاموں پر ہوشیاری کے ساتھ لگاتے چلے جا رہے ہوں۔

بنکنگ کے سلسلے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں پہلے جدید بنکنگ کی ابتدا بتائی گئی ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ نشو و نما پاکر اب یہ کاروبار کس طرح چل رہا ہے اس میں میرے پیش نظر بجائے خود بنکنگ پر فنی بحث کرنا نہیں ہے، بلکہ در اصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم میں قباحت کا پہلو کیا ہے۔ اور اس قباحت کے پہلو کو اس سے خارج کر کے وہ اصل ضرورت کیسے پوری کی جا سکتی ہے جس کے لیے ایک بنکنگ سسٹم درکار ہے اسی لیے میں زیادہ تفصیلی بحثوں میں نہیں گیا ہوں۔ آپ نے اپنا اعتراض اٹھاتے وقت اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ میں نے بنکنگ کی پیدائش اور نشو و نما کو تین مرحلوں میں بیان کیا ہے اور آپ نے ساری بحث کو ایک ہی مرحلہ بنا کر وہ باتیں جو ابتدائی دور سے متعلق تھیں موجودہ صورت حال کے متعلق سمجھ لی ہیں۔ نیز موجودہ صورت حال کو بھی آپ ایک مجرد مفروضہ کی صورت میں پیش کر رہے ہیں، حالانکہ میں تیسرے مرحلہ کے عنوان سے جو بحث کر رہا ہوں وہ بنکوں کے اس عملی طریق کار سے تعلق رکھتی ہے جس پر اب فی الواقع کام چل رہا ہے۔ آپ کے پاس اگر کتاب وہاں موجود ہو تو میری ساری بحث کو اس تقسیم کے مطابق پڑھیں جس طرح میں نے اپنے ذیلی عنوانات قائم کر کے کی ہے۔ پھر آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس پر وہ اعتراض نہیں اٹھتے جو آپ نے اٹھائے ہیں۔

آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ میں تخلیق زر CREATION OF MONEY کو بنکنگ کی تاریخ کا محض ایک پرانا باب سمجھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل اب بھی جاری ہے لیکن میں نے تیسرے مرحلے کی بحث میں اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ جس مدعا کی خاطر میں یہ ساری بحث کر رہا ہوں اس سے یہ چیز براہِ راست متعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، میری بحث کا مقصد بنکنگ پر فنی گفتگو نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے اس کے نقصان دہ پہلوؤں کو واضح کر کے اصلاح کی شکل پیش کرنا ہے۔

آپ کے آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ CREATION OF MONEY کی پشت پر اگر سود اور فریب نہ ہو تو اس میں کوئی حرمت کا پہلو نہیں ہے۔ اب یہ دیکھنا آپ لوگوں (یعنی اہل فن) کا کام ہے کہ معاشی ضرورت کے لئے ایک صحت مند تخلیقِ زر کا نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے جو قباحت کے پہلوؤں سے پاک ہو۔

کیا تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے؟

سوال: جیسا جناب نے فرمایا تھا، میرے استدلال کی بنیاد دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ ربٰو سے مراد زائد قرض کی وہی صورت لی جانی چاہیئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھی اور دوسرے یہ کہ تجارتی سود کا رواج چونکہ اس زمانے میں نہ تھا، سود کی یہ صورت قرآنی حکم تحریم میں نہیں آتی۔ جناب ان دونوں باتوں کو درست نہیں سمجھتے۔ مگر یہ دونوں جناب کی تصنیف "سود" حصہ اوّل کے صفحات ۴۳، ۴۵ کی بحث پر مبنی ہیں۔ جناب نے فرمایا۔ "قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے۔ اس لئے وہ اسے "الربٰوا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملہ کی ایک خاص نوعیت کو اس اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔۔۔۔ اور چونکہ "الرّبٰوا" ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام ہے اور وہ معلوم و مشہور تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی۔۔۔۔" اس کے بعد وہ روایات ہیں جن میں زمانہ جاہلیت کے ربٰوا کی مثالیں دی گئی ہیں اور ان کے بعد مرقوم ہے۔

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج نہیں۔ انہیں کو اہلِ عرب اپنی زبان میں "الربوا" کہتے تھے اور یہی وہ چیز تھی جس کی تحریم کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا۔" میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ جناب کی کتاب میں اور دوسری کتابوں میں "الربوا" کی جو مثالیں مذکور ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عرب تجارت کے لئے بھی قرض لیتے تھے اور اگر عرب میں تجارتی سود رائج نہیں تھا تو جناب کے اپنے استدلال کے مطابق "الربوا" کی زد میں نہیں آنا چاہیئے۔ اگر یہ نتیجہ نکالنے میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو مہربانی فرما کر مجھے اس سے مطلع فرمایئے اور علمائے کرام نے بھی مانا ہے کہ "الربوا" سے وہی بڑھوتری مقصود ہے جو ان دونوں حالتوں میں حاصل تھی اور ربوا کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔

اب رہی یہ بات کہ آیا زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تجارتی سود واقعی رائج تھا کہ نہیں۔ اس کے متعلق جناب فرما چکے ہیں کہ یہ بات صراحت کے ساتھ کسی کتاب میں نہیں لکھی گئی۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ ایسے سنگین معاملے میں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت سزا مقرر کی ہے قیاس پر عمل نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اصل حالات معلوم کرنے چاہئیں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ تاریخی امر ہے کہ یورپ میں پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان تجارتی سود کا رواج نہ تھا۔ اس کے لیے میں جناب کی خدمت میں مختلف کتابوں کے حوالے پیش کر سکتا ہوں۔ نیز جن کتابوں تک میری رسائی ہو سکی ان سے یہ معلوم ہوا کہ ان دنوں عرب میں تجارت نجی سرمایہ سے یا مضاربت سے ہوتی تھی۔ تجارت کے جتنے تذکرے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں کہیں تجارتی قرض کا ذکر نہیں۔ جناب کی علمیت اور وسعتِ مطالعہ سے مجھے امید تھی کہ جناب میری رہنمائی کسی ایسی کتاب کی طرف فرمائیں گے جس سے اس بات کے متعلق قابلِ وثوق حالات معلوم ہو سکیں۔ لیکن یہ امید بر نہ آئی۔ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں مصنفین نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ لیکن اس کا کہیں ذکر نہیں آتا کہ لوگ قرض لے کر تجارت کیا کرتے تھے۔ قریش تاجر تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سود پر روپیہ دیتے تھے۔ مگر کن کو؟ کھجور کے کاشتکاروں کو۔ طبقہ تجار کا ایک فرد بھی اپنا سرمایہ سود پر دیتا ہے تو کاشت کاروں کو۔ کیا

اس سے یہ گمان نہ ہو گا کہ تجارتی سود ناپید تھا ؟

جناب نے دریافت فرمایا ہے کہ قرض کی بہت سی مختلف صورتوں میں سے کس کس کو تحریم ربوا کے حکم سے خارج اور کس کس کو داخل کریں گے۔ سود کی وہ صورتیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھیں سب ممنوع ہوں گی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس وقت ذاتی ضروریات کے لیے اور اضطراری قسم کے قرض ہی لیے جاتے تھے اور ایسے قرض لینے والے لوگوں کو مہاجن اکثر لوٹتے تھے اور ان کو بچانا ضروری تھا اس لیے "ربوا" حرام ہوا۔ ایسے سود کی جتنی بھی مذمت کی جائے درست ہے اور اس کے مجرموں کے لیے جس قدر سخت سزا تجویز کی جائے بجا ہے۔ اس کے برخلاف ایسے قرض جن کے لینے والے نفع آور کاموں میں لگاتے ہیں ان پر سود جائز ہونا چاہیے۔ ایسے سود دینے والے اور لینے والے دونوں کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کئی دفعہ مدیون ان کو مضاربت پر ترجیح دیتا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ علمائے کرام ایسے سود کو "حرب من اللہ ورسولہ" جیسی سخت سزا کا مستوجب کیوں قرار دیتے ہیں۔ کیا اسلامی فقہ کے مطابق جرم اور اس کی سزا میں کچھ مطابقت نہیں ہونی چاہیے۔ ایسے سود پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:- ایک اس سے ایسا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو بغیر محنت و مشقت کے آمدنی وصول کرتا ہے۔ یہ اعتراض ان لوگوں پر بھی ہونے چاہئیں جن کے پاس بڑی بڑی زمینداریاں اور کئی کئی مکان ہیں اور وہ بن محنت گزر اوقات ہی نہیں بلکہ عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر اسلام ان نکھٹوؤں کو نہیں روکتا تو تجارتی سود لینے والا ہی کیوں مورد عتاب ہو ؟
دوسرے یہ کہ سود لے کر تجارت کرنے والے کو چاہے نقصان ہو مگر سود لینے والے کو منافع ہی ملے گا۔
یہ اعتراض کچھ حد تک درست ہے لیکن اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سود پر روپیہ تجارت کے لئے اس لئے لیا جاتا ہے کہ مدیون کو اس شرح سود سے کئی گنا زیادہ منافع کی امید ہوتی ہے اور بیشتر اوقات یہ امید پوری ہوتی ہے۔ ورنہ تجارتی قرض کو اس قدر فروغ نہ ہوتا۔ ایسے قرض دینے والے کو سالانہ ایک چھوٹی سی رقم ملتی رہتی ہے اور اس کے بدلے روپیہ لینے والا کبھی اس رقم سے کئی گنا زیادہ نفع کما لیتا ہے اور کبھی اس کو نقصان ہوتا ہے اس قسم کے خطرے

(RISK) کو قبول کرنا تجارت کا عام مسلک ہے۔ اور یہ ایسی چیز نہیں اور اس سے ایسی خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں کہ اس پر "الربوا" والی سزا لازم آوے۔ میرے خیال ناقص میں ہمیں سود کی نفع آور اور غیر نفع آور صورتوں میں تفریق کرنی چاہیے اور پہلی جائز اور دوسری ممنوع ہونی چاہیے۔

جناب نے اپنے خط میں یہ بھی فرمایا ہے" اس زمانے کے لوگوں کی نگاہ میں قرض ہر طرح کا قرض ہی تھا، خواہ نادار نے یا مال دار، خواہ ذاتی ضروریات کے لیے یا کاروباری ضروریات کے لیے"۔ کیا جناب موخر الذکر حصہ کی حمایت میں کوئی حوالہ دے سکتے ہیں؟ کئی سو سال سے تجارتی سود تمام دنیا میں رائج ہے اور لوگوں کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ مشکل ہو گیا ہے کہ اس بات کا تصور کر سکیں کہ ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب کہ تجارتی سود ناپید تھا۔ حالانکہ تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تجارت کی اغراض سے سود کا لین دین کم از کم مغربی ملکوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت رائج نہیں تھا۔

میں جناب کو بار بار تکلیف دے رہا ہوں۔ اس کی تین وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ عملاً لاکھوں مسلمان تجارتی سود لیتے یا دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو تجارت قائم رکھنی ہے جس میں روز بروز مقابلہ تیز تر ہوتا جاتا ہے، تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جناب نے اس بات کو نہیں مانا اور متبادل طریقے تجویز بھی فرمائے ہیں۔ لیکن میں بصد ادب عرض کروں گا کہ ہم لوگوں کی موجودہ ذہنی اور اخلاقی حالت میں وہ قابل عمل نہیں ہے۔ وہ اخلاقی معیار جس کی آپ کو اپنے ہم مذہبوں سے توقع ہے ایک نبی چاہتا ہے۔ اور ہمارے مذہب میں دوسرے نبی کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لیے مجھ ناچیز کے خیال میں ہمارے علمائے کرام کو چاہیے کہ مذہب کے تمدنی و معاشرتی معاملات میں ضرورت سے زیادہ سختی نہ برتیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کو یاد رکھیں۔ مزید برآں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس چیز کو قانون منع کرے اس کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا ہے وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ تجارتی سود بعض حالات میں بعض لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زیادہ تر اوقات فائدہ مند ہی ہے۔ اور اس کا نفع اس کے نقصان سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اس کی مناہی نہ ہونی چاہیے۔

دوسرے آج کل نئی ضروریات کے لیے اس قدر روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے کہ بوقت جنگ قرض کے بغیر چارہ

نہیں یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسری وجہ ذاتی ہے۔ میں سرکاری نوکری کے دوران میں جنرل پراویڈنٹ کے لیے روپیہ اپنی مرضی سے کٹواتا رہا۔ اس پر مجھے ایک کافی رقم سود کی ملی ہے جو میں نے نکال کر علیحدہ رکھ لی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ سود ممنوع ہے یا جائز۔ کیا جناب میری رہنمائی فرمائیں گے؟ اگر ممنوع ہے تو اس رقم کو اب کس کام میں خرچ کیا جا سکتا ہے؟ کیا حاجت مندوں کی امداد پر اسے خرچ کرنا جائز ہوگا؟ اس رقم کی حرمت و حلت معلوم کرنے کے لیے مجھے جستجو کرنی پڑی۔ اس میں میں نے سود پر جتنی کتابیں ملیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن چند نکتے صاف نہ ہو سکے۔ اور ان کو آپ کے سامنے حل کے لیے پیش کرنے کی جرأت کر چکا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمادیں گے۔ اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ لیکن اس خط کے جواب کے بعد جناب کو مزید تکلیف نہ دوں گا۔

جواب:۔ بے شک میں نے یہ لکھا تھا، اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قرض پر جس نوعیت کی زیادتی کو عرب میں الربوٰا کہا جاتا تھا، قرآن میں اسی کو حرام کیا گیا ہے۔ لیکن آپ اس بات کو جس معنی میں لے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرض کی جو قسمیں عرب میں اُس وقت رائج تھیں، اُن میں قرآن نے اصل سے زیادہ لینے کو حرام کیا ہے۔ حالانکہ میں نے، اور تمام فقہائے اسلام نے بالاتفاق، قرض کی نوعیت کا نہیں بلکہ زیادتی کی نوعیت کا استنباط کیا ہے۔ اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ عرب میں زمانہ نزول قرآن کے وقت اصطلاحاً لفظ خمر صرف انگور کی شراب کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دوسری قسم کی شرابیں جو اس زمانے میں بنتی تھیں، ان پر بھی مجازاً یہ لفظ بول دیا جاتا تھا۔ بہرحال جب قرآن میں اس کی حرمت کا حکم آیا تو کسی نے بھی اس کا یہ مطلب نہیں لیا کہ یہ حکم تحریم صرف اس قسم کی شراب یا اُن اقسام کی شرابوں کے لیے، جو عرب میں اس وقت رائج تھیں، مخصوص ہے۔ بلکہ یہ سمجھا گیا کہ ان سب میں جو ایک صفت مشترک، یعنی نشہ آور ہونے کی صفت، پائی جاتی ہے، اصل حرمت اسی کی ہے اور وہ جس قسم کی نوشیدنی یا خوردنی چیز میں پائی جائے وہ اس حکم کے تحت آتی ہے۔

اسی طرح عرب میں قرض کے معاملات کی بھی چند صورتیں رائج تھیں۔ ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ لین دین کی قرارداد میں، اصل سے زائد ایک رقم ادا کرنا بطور شرط کے شامل ہوتا تھا اور اسی کا نام اہل عرب

ربوا' رکھتے تھے۔ قرآن میں جب ربوا کی حرمت کا حکم آیا تو کسی نے اس کا یہ مطلب نہ لیا کہ یہ حکم انہی اقسام قرض سے متعلق ہے۔ جو عرب میں اس وقت رائج تھیں۔ بلکہ شروع سے آج تک کے تمام فقہا نے اس کا یہی مطلب لیا ہے کہ وہ زیادتی ممنوع ہے جو اصل رقم قرض پر بطور شرط عائد کی جائے۔ قطع نظر اس کے کہ قرض کسی نوعیت کا ہو۔ اس بات کی طرف خود قرآن میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔ وان تبتم فلکم رؤس اموالکم (البقرہ - ۲۷۹) اور اگر تم توبہ کر لو تو اپنے راس المال لینے کے حقدار ہو"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راس المال سے زیادہ لینا ہی ربوا ہے۔ اور اسی کو قرآن حرام کر رہا ہے اگر قرض کی بعض خاص صورتوں ہی میں یہ زیادتی حرام کرنی مقصود ہوتی تو اشارے کنائے ہی میں یہ مقصد ظاہر کر دیا جاتا، مثلاً یہی کہہ دیا جاتا کہ حاجتمند کو قرض دے کر زیادہ نہ وصول کرو۔

آپ حاجت مند کی شرط قرآن میں نہیں پاتے بلکہ باہر سے لاتے ہیں اور یہ شرط بڑھانے کے لیے جو دلیل آپ پیش کرتے ہیں۔ اس سے بہت بڑی اصولی قباحت یہ واقع ہوتی ہے کہ ایک سود ہی نہیں۔ قرآن کے سارے احکام ان حالات و معاملات کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں جو عرب میں اس کے نزول کے وقت پائے جاتے تھے۔ نیز یہ استدلال کر کے آپ ایک بڑا رسک RISK بھی لیتے ہیں۔ آپ کے پاس اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص قرض لے کر تجارت نہیں کرتا تھا نہ اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ دورانِ تجارت میں بھی کوئی تاجر کبھی دوسرے تاجر یا ساہوکار سے قرض نہ لیتا تھا۔ یہ دونوں باتیں آپ نے صرف عام تاریخی بیان سے نکال لی ہیں کہ اس زمانے میں تجارت نجی سرمایہ سے یا مضاربت پر ہوا کرتی تھی اور تجارتی سود کا رواج بہت بعد میں ہوا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے تاریخی بیانات، جو ایک عمومی کیفیت پیش کرتے ہیں، کبھی اس امر کا ثبوت نہیں ہو سکتے کہ اس زمانہ میں کوئی دوسری صورت واقع نہ ہوتی تھی۔

میں نے جو پچھلے خط میں عرض کیا تھا کہ اس زمانے کے لوگ ہر قسم کے قرض کو قرض ہی سمجھتے تھے خواہ نادار سے یا مالدار، اور خواہ ذاتی ضروریات کے لیے یا کاروباری ضروریات کے لیے، یہ میرا قیاس ہے اور اس بنیاد پر ہے کہ میری نگاہ سے قدیم زمانے کی تحریروں میں کبھی قرض کی اقسام

قرض لینے والے کی حالت یا غرض کے لحاظ سے نہیں گزریں، حالانکہ انسان ہر زمانے میں قرض مختلف اغراض کے لئے لیتا رہا ہے، اور قرض لینا صرف نادار لوگوں تک کبھی محدود نہیں رہا ہے۔

اس وقت میرے لئے یہ بحث کرنا مشکل ہے کہ نفع آور اغراض کے لئے بھی قرض پر سود لینا کیوں حرام ہونا چاہیئے۔ "تفہیم القرآن" اور "سود" میں اس کے متعلق اپنے دلائل بیان بھی کرچکا ہوں۔ سردست صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میری رائے میں پراویڈنٹ پر جو سودی رقم آپ کو ملی ہے اسے آپ اپنی ذات پر خرچ نہ کریں۔ اگر آپ کو اس کے حرام ہونے کا یقین نہیں ہے، تب بھی یہ رقم مشکوک تو ہے۔ آپ جیسا نیک دل آدمی ایک ایسی چیز سے کیوں فائدہ اٹھائے جس کے پاک ہونے کا یقین نہ ہو، خصوصاً جبکہ آپ اس کے محتاج بھی نہیں ہیں۔ بہتر یہ ہو کہ آپ اس سے ایک ایسے فنڈ کی ابتدا کریں جو حاجت مند لوگوں کو بلا سود قرض دے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دوسرے بہت سے لوگ بھی، جن کو اس طرح کی سودی رقمیں ملی ہیں، یا آئندہ ملیں گی، اس فنڈ میں اپنی رقمیں بخوشی داخل کردیں گے اور ایک اچھا خاصا سرمایہ اس کام کے لیے جمع ہوجائے گا۔